ڈاکٹر عابد خورشید (اسسٹنٹ پروفیسر: غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان)
ڈاکٹر جمیل الرحمان (اسسٹنٹ پروفیسر: غازی یونیورسٹی، ڈیرہ غازی خان)
ڈاکٹر طاہر عباس (اسسٹنٹ پروفیسر: اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور)

وزیر آغا کی طویل نظمیں

Abstract:
Dr. Wazir Agha is a renowned and respectable name in Urdu literature. His dynamic and creative personality has imparted the pearls of poetry, Inshaya (Light Essays) and criticism. This article throws light on his valuable work of Long Poems that are unique in their patterns forms and themes. One of the fascinating poem "Aadhi Saddi ke Bad" gets the attention of the reader due to its special taste and texture. This poem has crossed the geographical boundaries and this intellectual work has been translated in different local and international languages i.e. English Swedish, Greek, Spanish, Hindi etc. Study of such long poems is a unique and pleasant experience indeed, with modern perspectives.
Key Word: Long poem, distinguished poet, Dr Wazir Agha, modern genre, new pattern and form, locale of Culture, subject wholeness, symbolic presentation

اُردو میں طویل نظم اپنے منفرد مزاج اور اسلوب کے باوصف جداگانہ تشکیل کی مرہون منت ہے۔ اِس صنف نے قاری کو عجلت پسندی کے بجائے سیر ابیت عطا کی ہے۔ اظہاریے کو مختصر مزاج سے نکال کر وسعت آشنا کر دیا ہے۔ یوں اِس شش جہت پھیلاؤ نے تہذیبی و ثقافتی ورثے کی کڑیوں کو مربوط کرنے میں اپنا اہم کردار انجام دیا۔ طویل نظم کا ایک پہلو اِس کا رجائی انداز بھی ہے، جو زندگی کے لیے ایک مثبت لائحہ عمل کا زائیدہ ہے۔ طویل نظم کسی لمحاتی کیفیت کی اُچٹتی نظر میں معلق ہو کر نہیں رہ جاتی بلکہ تخیل اور جذبہ کی وارفتگی اور کثرت اِسے ٹھہراؤ عطا کرتی ہے۔ طویل نظم کی شعریات میں طوالت ایک اہم عنصر ہے، جو اِس صنف کو مختصر نظم سے امتیاز عطا کرتا ہے۔ طویل نظم کا موضوع درخت کی شاخوں کی طرح ظاہری طور پر نظر آنے والے پھیلاؤ کی طرح تو دِکھائی دیتا ہے، کیا زمین کے اندر بھی جڑوں کی صورت اُتنا ہی گہرا ہے یا نہیں! طویل نظم کو کسی صورت

بھی مصرعوں کا انبار ہر گز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا شمار طویل نظم کے رجحان ساز شاعر کے طور پر ہوتا ہے، اُن کی طویل نظموں کا مطالعہ اِس صنف کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے :

اَندر کے رونے کی آواز
سارے موسم
چہکتا ہوا ایک موسم بنیں!
رنگ بکھریں
قباؤں پہ، چوغوں پہ، کوری رداؤں پہ نقشے بنائیں[1]

ڈاکٹر وزیر آغا (18 مئی 1922ء تا 7 ستمبر 2010ء) کی طویل نظم ''اندر کے رونے کی آواز'' اُن کے شعری مجموعے گھاس میں تتلیاں میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں ادبی رسالہ اوراق کی اشاعت جولائی، اگست 1984ء میں بھی اِسے شائع کیا گیا ہے۔ نظم Inerself سے مکالمے کی بازگشت ہے۔ ہجر اور جدائی کے انسلاک سے جنم لینے والی گونج جب قاری پر اپنا پہلا ہی تاثر چھوڑتی ہے تو اُس کی گرفت کا حصار آخر تک قائم رہتا ہے :

''وداع کا وہ منظر میں بھولا نہیں ہوں'' (گھاس میں تتلیاں: ص 131)

یہ طرزِ احساس اُسے فرقت کے اُس لمحے نے دیا ہے جہاں وہ ریل کی سیٹی کی گونج سے دولخت ہو چکا ہے، گویا وہ ایک ایسے جہان میں تنہا رہنے پر مجبور ہو چکا ہے جہاں وہ کسی کے ہونٹوں پہ موجزن شفق اور آنکھوں میں ستاروں کی اُجلی کرن کو وداع کر چکا ہے۔ اُس کے سامنے منظروں کا نوع بہ نوع ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ مگر یہ منظر نہ تو اُدھورے ہیں اور نہ ہی بے معنویت (Absurdity) کی کسی صورت میں ڈھل رہے ہیں۔ نظم میں پرندہ، ریل، ندی، بارش، تتلی، دھواں، آواز، موسم ایسے تلازمات ہیں جن سے ''یاد'' کا انسلاک فطری ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ نظم، تیز بارش کے بعد پتّوں سے لرزتی اور پھر ٹپکتی بوندوں کی طرح پڑھنے والے کے احساسات پر گر رہی ہے۔ اور اُسے اُس آواز کی بازگشت سُننے کے لیے اُبھارتی ہے جو لبوں کو مقفل کیے اپنے ہی اندر سُلگ رہی ہے :

آواز مجھ کو ہمیشہ سے آتی رہی ہے
میں اندر کے رونے کی اِس بھیگی آواز کو جانتا ہوں

ازل سے میں اس بھیگی آواز کو سن رہا ہوں
اسے خوب پہچانتا ہوں!![۲]

مغرب سے نظم جدید کی ہیئتی پرچھائیوں نے اُردو نظم پر بھی اپنے اثرات مرتسم کیے،اِن میں موزیک، مونتاج اور کولاژ (کولاج) اہم ہیں۔بنیادی طور پر کولاژ مصوری کی اصطلاح ہے۔جس میں مختلف چیزوں (امیجز) کو چسپاں کر کے تصویر کے خدوخال اُبھارے جاتے ہیں۔زیریں سطح پر ایک مخفی لہر ہے جو آپسی ربط بناتی ہے ۔بالکل شیشے کے اُن ٹکڑوں کی طرح جن میں ہر ٹکڑا اپنے اپنے عکس محدود زاویے سے دکھاتا ہے مگر جب وہی ٹکڑے جڑ کر ایک مہا تصویر میں ڈھل جاتے ہیں تو ایک مختلف تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ہمارے ہاں شاعری میں ترکیب سازی کا عمل کولاژ (کولاج) کو سمجھنے کے لیے ہماری مدد کر سکتا ہے، کیوں کہ ترکیب میں بھی ہر لفظ کا اپنا انفرادی معنی ہوتا ہے لیکن جب دو یا دو سے زائد الفاظ مل کر ایک ترکیب بناتے ہیں تو ہر لفظ اپنے انفرادی معنی کو معطل کر کے،ایک نئے معنی کو جنم دیتا ہے۔مثال کے طور پر ''کاسہ شام'' میں کاسہ اور شام کے اپنے اپنے معنی ہیں لیکن ترکیب میں جڑ کر ایک نیا معنی پیدا ہو جاتا ہے۔کولاژ کی حیثیت بھی ایسی ہی ہے۔

کولاژ کی ہیئتی صورت بھی ہے اور تخیلاتی بھی۔وزیر آغا کی مذکورہ نظم ''اندر کے رونے کی آواز'' کے یہ چند صوری امیجز اپنے طور پر اور مجموعی لحاظ سے ایک ایسی فضا Create کرتے ہیں، جہاں قاری بیک وقت ایک ہی نظم پڑھتے ہوئے دو مختلف سطحوں سے گزرتا ہے،اور یہ دونوں ہی زاویے اُس کے لیے جہانِ نو کا درجہ رکھتے ہیں :

دور تک، ہر طرف
ملگجے سے اندھیرے کی زنجیر تھی
رات بھیگی ہوئی تھی (گھاس میں تتلیاں: ص131)

مگر ریل
ندی میں بہتے ہوئے ایک تنکے کی صورت
بس اِک پل رُکی (ایضاً: ص132)

دھواں موقلم تھا
پُرانی حکایت نئی طرز میں لکھ رہا تھا (ایضاً: ص132)

چاروں طرف سے.....اُسے
اُس کے اپنے ہی سایے نے گھیرا ہوا ہے (ایضاً: ص134)

وہ اپنی ہی آواز کی قید میں ہے
ہمہ وقت اپنے ہی خنجر کی زد پر کھڑا ہے (ایضاً: ص134)

پھیلے ہوئے ''ہست'' کے ایک گوشے میں
سمٹا ہوا ایک پنچھی ہے (ایضاً: ص135)

نظم کی مجموعی فضا اُداس کر دینے والی ہے، یہ اُداسی شاعر کو مرتکز کرتی ہے نہ کہ وہ بکھراؤ کی طرف گامزن ہوتا ہے۔ مرتکز ہونے کے عمل سے دھیان انجماد کی طرف بھی منتقل ہو سکتا ہے لیکن اِس حوالے سے بھی نظم کی گمبھیرتا بالیدگی سے ہم رشتہ ہو کر جذب کی کیفیتوں سے نامعلوم کو مس کرتی ہے اور اپنے اندرونی آہنگ کے باعث ایک بڑی نظم کہلائے جانے کی مستحق ہے، یہ چند مناظر ملاحظہ کیجیے:

پرندہ!
اگر ریل کی دُکھ بھری چیخ سنتا
تو اِک پل میں بیدار ہوتا
لرزتی ہوئی شب کی پلکوں سے
آنسو کی اِک بوند بن کر ٹپکتا (ایضاً: ص131)

لبوں کو مقفل کیے
اپنے اندر ہی اندر سُلگتی رہی ہے
سدا اپنے اندر ہی اندر سُلگتی رہے گی (ایضاً: ص132)

دھرتی.....جواب تک اُسے

گود میں لے کے لوری سُناتی رہی تھی
لرزتی ہوئی اُس کی پلکوں پہ
پل بھر چمک کر
ابھی ایک موٹے سے آنسو کی صورت
سُلگتے ہوئے سرخ لاوے کی ٹھہری ہوئی جھیل میں
جا گری ہے (محولا بالا: ص135)

ڈاکٹر وزیر آغا اپنی اِس نظم میں ''ربطِ اولین'' کے لمس سے بھی آشنا ہوئے ہیں، اُن کے ہاں جذبے کی ایسی نرم اور نازک، احساسی صورت ہمارے سامنے آتی ہے کہ پھولوں کی پتیوں پر اوس کے قطروں کا گمان ہوتا ہے۔ اور دوسری لہر اُن کے اندر اُس سلگتی چنگاری کو ہوا دیتی ہے جس کے بارے میں امین راحت چغتائی لکھتے ہیں :

''نظم میں وزیر آغا نے اپنے غم کو کائنات کا غم بنا دیا ہے۔ بنی آدم اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے، یعنی اپنا مواخذہ خود کر رہا ہے۔''(۳)

الاؤ

ڈاکٹر وزیر آغا کی طویل نظم ''الاؤ'' اُن کے شعری مجموعے گھاس میں تتلیاں کا حصہ ہے۔ بعد ازاں یہ نظم اَدبی رسالہ اوراق کی اشاعت مئی، جون 1983ء میں بھی شامل ہوئی۔ الاؤ کی عمومی صفات میں گھٹن، دباؤ، جبریت کا نفوذ، فطری لپک، تغیرات ایسے تلازمات شامل ہیں۔ کیا عجب ہے کہ نظم میں بھی ایسے الفاظ در آئے ہیں جن کی تپش پڑھنے والے کو بھی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً 'گرم خوابوں کی لوری'، 'سرخ سورج کے بھالے'، 'چمک دار جبڑے'، 'بدن کی حرارت'، 'برق کی قاش'، 'جھونکے کی تُندی'، 'لہو کی جوالا'، 'الاؤ کی اُجلی تمازت'، 'سرخ قشقہ'، 'سلگتے اعضا' وغیرہ ایسے اشارے ہیں جن سے حدت کی موجودگی کا واضح احساس ہوتا ہے، جو زیر سطح رونما ہونے والے جوار بھاٹے کو اُس فشاری قوت سے مس کر رہی ہے جسے آخر کار ''الاؤ'' کا روپ دھار لینا ہے، یہی صورت انسانی کے اندر پکنے والی اُس کیفیت کی غمازی بھی کرتی ہے جو اپنا اظہار چاہتی ہے، جو ساری حدوں کو توڑ کر ہر رشتے ہر تعلق کو مسمار کر دینا چاہتی ہے، جو نہ جانے کتنے عرصے سے سلگ رہی تھی :

اپنی آواز سے تم بچھڑتے گئے
اور درختوں، مکانوں،

گپھاؤں سے

لاکھوں کی تعداد میں سال خوردہ

گرسنہ صدائیں

تمھیں دیکھ کر تلملاتی رہیں (۴)

نظم کی کئی پرتیں ہیں، ان میں انکشاف ذات ایک اہم پرت ہے، فرد اور معاشرے کا تصادم اور اُس سے جنم لینے والی ناہمواری، وہ پیچیدگی جو اُسے غیر مربوط اور منقسم نظریات کی سرحد پر لا کھڑا کرتی ہے، جہاں دھندلی فضا اپنے پنجے گاڑھ لیتی ہے اور ہر منظر غیر شفاف ہونے لگتا ہے، اِن کیفیات کو تخت سنگھ اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

''سوچتا ہوں جس گم شدہ آواز کو وزیر آغا نے الاؤ کو روشن رکھنے کے لیے ایندھن کے طور پر استعمال کیا ہے، آخر وہ ہے کیا؟ کیا قوتِ حیات کی گم شدگی کا ماتم تو نہیں منایا گیا یا ضمیر انسان کی مردہ آواز پر طنز کیا گیا ہے؟ اس مشینی جُگ میں اپنی پہچان کھو چکے انسان کو تو ہدفِ ملامت نہیں بنایا گیا؟ یہی خیال انگیزی تو اِس طویل نظم کا اصل مدعا ہے۔''(۵)

تاریخی شعور کے ساتھ دیومالائی کیفیتیں بھی نظم کے اہم پہلو ہیں، جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا لیکن نظم کا کوئی حصہ بھی شعریت سے تہی نہیں ہے، الفاظ کا ایسا سبھاؤ ہے جس میں تفہیم کی ترسیل اور تفہیم کے نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔ فرد اور معاشرے کا تعلق اکہری معنویت کے باوصف باطن سے اُٹھنے والی ہر کیفیت پر اپنا پرتو ثبت کر دیتا ہے۔ بلراج کومل لکھتے ہیں :

''اس مسلسل شعلگی اور آتش زدگی کے روحانی، جذباتی اور وجودیاتی تجربے کے الاؤ کی ہم سفر شاید ایک اور زیر زمیں موج نرم رو۔ وزیر آغا کے ہاں شروع سے آخر تک موجود ہے۔''(۶)

تمھاری صدا

سارے عالم کی واحد صدا تھی

کہاں تم نے کھو دی وہ اپنی صدا؟

بولتے کیوں نہیں ہو؟؟[۷]

نظم ایک روحانی تجربے کو آشکار کرتی ہے، دورانِ قرات، قاری ایک اَن جانی گرفت میں آ جاتا ہے۔تاہم اِس گرفت کو فرد کی تنہائی کا المیہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ایک ایسا احساس جو کل سے ٹوٹ کر لخت لخت ہو چکا ہے، لیکن اِس کیفیت کا حصار شعری کائنات سے باہر نہیں،احمد ظفر لکھتے ہیں :

''فرد کے المیے کو بڑی خوبی،رکھ رکھاؤ اور پورے محرکات کے ساتھ اور اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔''[۸]

مظہر الزمان خان لکھتے ہیں :

''الاؤ ،ایک ایسی نظم ہے جو زمین سے اُٹھ کر شفق بن جاتی ہے۔''[۹]

''فاعلاتن فعولن فعولن فعول''ارکان کی حامل اِس نظم میں لفظ کی مفرد حیثیت کا اعلامیہ دراصل ایک ایسی خود مختار اکائی کی صورت سامنے آیا ہے، جسے کسی قسم کا آرائشی روپ پسند نہیں۔''الاؤ '' میں اِس کا اظہار منفرد طریقے سے ہوا ہے، نظم میں کوئی اضافت نہیں،لیکن مصرعوں میں الفاظ کا ایک فطری رشتہ بھی ہوتا ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ایک دوسرا پہلو نظم میں علامتی آہنگ کا در آنا بھی ہے۔سنتوکھ سری بھی اِس پہلو کی طرف متوجہ ہوتے دِکھائی دیتے ہیں:

''اِس نظم میں دو مرکزی نکات ہیں۔الاؤ اور پریت۔الاؤ جو عمل، حرکت،اجتہاد،انقلاب اور ضیا کی علامت ہے اور پریت، جس کے کچے دھاگے میں دنیا کی ہر شے بندھی ہے۔''[۱۰]

ایک گہرے تاریخی شعور کی حامل اس طویل نظم کا آغاز چاردِیواری کے جذباتی ماحول سے ہوتا ہے اور یہ نظم کائناتی رشتوں کو نہ صرف مس کرتی ہے بلکہ بڑی مضبوطی سے اُن سے اپنا تعلق جوڑ لیتی ہے۔

۔ ت ۔ ی

ٹرمینس

وزیر آغا کی طویل نظم ''ٹرمینس''اُن کے شعری مجموعے گھاس میں تتلیاں میں شامل ہے بعد ازاں یہ نظم ادبی رسالہ سمبل میں بھی شائع ہوئی۔اوراس اشاعت کی خاص بات یہ ہے کہ اِس رسالے میں وزیر آغا کے ہاتھ سے لکھی ہوئی نظم کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے۔اِس لیے حوالہ کے طور پراسی اشاعت کا انتخاب کیا گیا ہے۔ نظم کے

معروضی نکات میں جن زاویوں پر بات کی گئی ہے اُن میں سے چند ایک کا ذکر تو خود شاعر نے بھی حاشیہ میں کر دیا ہے۔یعنی دریائے چناب پر چھنی کھجی کے مقام پر ریلوے لائن کا فل سٹاپ تھا جہاں سے آگے گاڑی نہیں جا سکتی تھی ،وغیرہ۔یہ نظم اُس سٹیشن اور اُس کے گردونواح کا بیانیہ ہے لیکن بباطن یہ نظم بہت گہری ہے، یہ محض ایک نسل کا دوسری نسل سے مکالمے تک ہی محدود نہیں بلکہ اِسے کی جڑیں ایک تہذیب سے دوسری تہذیب تک پھیلی ہوئی ہیں :

سیہ، ریل کی لائنیں

اِک پہاڑی کے سینے سے ٹکرا کے

رُک سی گئی ہیں

ہزاروں برس سے

وہیں..... چھنی کھجی کے قدموں میں

بے حس پڑی تھیں(۱۱)

یہ محض ریلوے لائنیں نہیں ہیں بلکہ وہ کہنہ روایات ہیں جو زنگ آلود ہو چکی ہیں۔نہ صرف اِس نے نظام کو بنجر کر دیا ہے بلکہ ہر آنے والی تبدیلی بھی یہاں آ کر رُک جاتی ہے۔منہ زوری اور طاقت بھی یہاں آ کر بے بس ہو جاتی ہے کیوں کہ ایک طرف پانی کی اتھاہ گہرائی ہے اور دوسری طرف کالے ،چٹیل پہاڑوں کی قدیمی آماج گاہیں ہیں۔اگر نظم کے اُس حصے کو توجہ دیں جس میں بچہ اپنے بابا سے یہ جگہ دیکھنے کی ضد کرتا ہے تو وہ اُسے جواب دیتا ہے کہ تم وہاں جا کر کیا کرو گے۔وہاں تو بس ایک ''آہنی سرخ کمرہ'' ہے جہاں لائنیں رُک جاتی ہیں اور ایک سیہ تختے پر لکھا ہوا ہے:

''اب آگے کچھ بھی نہیں ہے'' (سمبل: ص415)

اور پھر جب بچے کے مجبور کرنے پر بابا اُسے ''چھنی کھجی''(جو ایک علامتی پیرایہ ہے) لے جاتے ہیں تو بچے کے سامنے جو تصویر اُبھرتی ہے اُس میں ریل کی کھڑکیوں کے منظر میں پُراسراریت کی ایک جھلک نظر آئی جس میں ''بکھری ہوئی دھجیاں''اور نیلے فلک کو بادلوں کے دریدہ لبادے نے سب پر عیاں کر دیا :

زمانے کی پھیلی ہوئی ڈور میں

چھنی کھینچی گرہ ہے

گرہ کھل گئی گر

تو کچھ نہ رہے گا!(۱۲)

''سرخ سگنل، کف آلود دریا، آہنی پل، پہاڑی کا سینہ، زرد بچے، آہنی سرخ کمرہ، لوہے کا کمرہ، زنگ آلود ماضی، پہاڑی کی دِیوار، مردہ لمحے، سیہ ننگی بانہیں، بھیگا ہوا پرندہ، چکنے پتھر'' یہ ایسے تلازمات ہیں جن کی مدد سے ایک بہت بڑے تہذیبی و ثقافتی دائرے(Cultural Circle) کا فکری طور پر احاطہ کیا جا سکتا ہے :

میں اُس روز لمحے کے پل کو اگر پار کرتا

تو پھر رُک نہ سکتا

اگر کف اُڑاتا ہوا تُند دریا

مجھے راستہ دے ہی دیتا (۱۳)

دراصل کسی پُل کو پار کرنے کی خواہش ہی تبدیلی کی خواہش ہے۔پل ایک Boundary بھی ہے۔جو اِس کے پار گیا، سو گیا۔یعنی اب اُس کا واپس آنا قسمت سے ہی ہو گا۔پل ملنے او بچھڑنے کا ایک سنگم ہے۔اور ''تند دریا کا رستہ دینا'' بھی اُسی خواہش کی تکمیل کا ایک روپ ہے۔یہ ایسی رکاوٹیں ہیں جن کے سامنے اِرادہ بے بس ہے۔خواہش اُدھوری ہے۔جذبہ خوابیدہ ہو چکا ہے اور جرات بے ہمتی کی تصویر بنی ہوئی ہے:

میں.....ازل اور ابد کے کناروں میں

بے نام، بے سمت

اَن گھڑ سے گھوڑے کی ٹوٹی رکابوں سے

چمٹا ہوا

بس بھٹکتا ہی رہتا

بھٹکتا ہی رہتا!!(۱۴)

نظم میں کوئی اضافت نہیں۔ یہ ہنر وزیر آغا کی نظم کا وصف بھی ہے۔ وہ مفرد لفظ کو اُس کی زنبیل، یعنی یک رخے معانی سے نکال کر آئینے کی صورت عطا کر دیتے ہیں کہ جس سے عکسوں کا ایک لامتناہی سلسلہ جنم لیتا ہے۔ امین راحت چغتائی ''ٹرمینس'' کو وزیر آغا کے شعری نظام سے منسلک کرنا چاہتے ہیں، وہ لکھتے ہیں :

''ٹرمینس بڑا حکیمانہ موضوع ہے۔ وزیر آغا ہستی کی گتھی سلجھانا تو چاہتے ہیں لیکن خود شناسی کے حوالے سے اپنے تشخص کے دائرے میں رہ کر! نظم کو وزیر آغا کے نظام فکر کے اجزائے ترکیبی سے ملا کر دیکھا جائے تو اس کے نین نقش کچھ اور تیکھے نظر آتے ہیں۔''(۱۵)

''ٹرمینس'' کے حوالے سے ارمان نجمی نے قلبی واردات سے انسلاک کیا ہے، جس سے نظم کی ایک نئی پرت وا ہوتی ہے اور نظم کو ایک نئے منظر نامے میں دوبارہ پڑھنے کی خواہش بیدار ہوتی ہے اور ایک نئی سرابیت کا احساس جنم لیتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''ٹرمینس' اگرچہ بچپن کے اِک تجربہ کی بازیافت ہے مگر ساتھ ہی قلبی واردات کی سرگذشت بھی ہے۔ اُفقی اور عمودی سمتوں کی بیکرانی کے ادراک سے پیدا شدہ کیفیتوں کے سرور نے اِسے روانی تناظر عطا کیا ہے جس کی بدولت یہ شخصی وجدان کی حکایت بن جاتی ہے۔''(۱۶)

اِک کتھا انوکھی

اِک جنگل تھا

گھنی گھنیری جھاڑیوں والا

بہت پُرانا جنگل

.....

اپنے بدن کی چھال میں لپٹا

اپنی کھال کے اندر گم صم

.....

بے سُدھ

بے آواز پڑا تھا[۱۷]

ڈاکٹر وزیر آغا کی طویل نظم ''اِک کتھا انوکھی'' اُن کے اِسی نام کے مجموعے میں شامل ہے۔ شعری مجموعہ اِک کتھا انوکھی میں اِس نظم کے علاوہ چند ایک مختصر نظمیں اور غزلیں بھی شامل ہیں۔ ''اِک کتھا انوکھی'' اپنے اچھوتے اسلوب کے ساتھ ساتھ فنی لحاظ سے بھی گہرے مطالعے کی متقاضی ہے۔ یہ نظم بحر متقارب مزاحف یعنی فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فع/فاع کے وزن پر لکھی گئی ہے، اور ضرورت کے مطابق سطروں کو فعلن ، فعل، فعولن میں بھی ڈھالا گیا ہے۔ چھوٹے سطروں کی اِس طویل نظم میں مخصوص روانی ہے، جس نے نظم کو مزید جولانی عطا کی ہے۔ اِس نظم کا منظوم پنجابی ترجمہ ڈاکٹر یونس خیال نے نہایت خوبی سے کیا جو پنجابی لاہور میں بھی شائع ہوا۔ نظم کے مجموعی مزاج کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی یہ رائے ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ نظم کہانی کی تکنیک میں لکھی گئی ہے۔ کہانی کا کچھ حصہ بیانیہ اور بیشتر حصہ مکالماتی ہے۔ کہانی کا بیان کنندہ شاعر ہے اور مکالمہ، شاعر اور ایک تخیلی اساطیری کردار کے درمیان ہوتا ہے۔ چونکہ ان کرداروں میں ایک شاعر اور دوسرا اساطیری فرد ہے، اس لیے پوری نظم کی زبان، امیجری اور فضا اساطیری اور علامتی ہے۔ اس نظم کو جدید عہد کی اسطورہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا۔''[۱۸]

میں کہتا ہوں:

تُو کس جُگ میں رُکا کھڑا ہے

آنکھیں کھول کے باہر آ

اور دیکھ کہ گلیاں سب

اُجڑی ہیں[۱۹]

اِس نظم کو انسانی المیوں کا نوحہ بھی قرار دیا سکتا ہے لیکن ہر وضع کی آلودگی کے لیے لفظ کا دیپ ہی واحد راستہ ہے۔ نظم میں اساطیری ماحول کے باوجود اسلوب نہایت رواں ہے۔ مکالمے کا انداز تخلیقی ہے۔

رابرٹا گاڈنسٹن (Roberta God Lstein) کا درج ذیل پیراگراف ڈاکٹر وزیر آغا کی اِس طویل نظم کا شاندار اعتراف ہے، ملاحظہ کیجئے:

> Wazir Agha in his apocalyptic poem has created a tale to remember. His intensely vivid imagery and use of symbolism swiftly involve our mind, senses and spirit in this gripping tale of doom.(۲۰)

''پُرانا جنگل، بدن کی چھال، ٹھنڈی پوریں، بانجھ ملوں کے پنجر، فولاد کا راج، وحشی گرداب، نسلی پاگل پن، آگ کے دُرّے، بجلی کی سیڑھی، مہتاب کا کاسہ، لفظ کا دیپ'' ایسے تلازمات ہیں جن کی مدد سے ذہن انسانی کی کروٹوں کو پڑھنے کے ایسے کوڈز، ڈی کوڈ ہو سکتے ہیں جو پتھر سے لوہے تک کی سر گزشت بیان کرنے کے لیے کافی ہیں۔ جہاں یہ نظم علامتی پیرائے میں اپنے Fragments چھوڑتی جاتی ہے وہیں اِس کا انداز بہت سامنے کا سا ہے، یعنی ''تتلی، بھونرا، کوئل، چڑیا'' ایسے کومل جذبے لوہے کی ساخت ایسی بے حسی میں بدل جاتے ہیں:

ساگر جس نے

اِن کیڑوں کو جنم دیا تھا

اَب اِک گندا جوہڑ بن کر

اِن کے اَندر کے جوہڑ سے

آن ملا ہے(۲۱)

Dr. Werner Manheim جدید انسان اور اُس سے وابستہ خواہشات کا تکملہ اِس نظم میں تلاش کرتے ہیں، اور اِس تناظر سے زائیدہ محرکات کو یوں بیان کرتے ہیں:

> It is a powerful demonstration of modern man`s loss of spirit and of his failure to fulfil his task on earth. It is marvellous document about the weakness of modern man and his lost opportunities.(۲۲)

نظم میں تلمیحات کا ایک جہان آباد ہے۔ اساطیری کرداروں کے ساتھ، ہندو مدیومالا کے حوالے بھی در آئے ہیں، جن کی بہت سی توجیحات ہیں۔ امین راحت چغتائی اُن میں سے چند ایک کا ذکر اِن الفاظ میں کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ہماری دھرتی دوسری بار ناقابل تصور حد تک بھیانک دورِ ابتلا سے گزر رہی ہے۔ ایک بار طوفانِ نوح سے تہس نہس ہو گئی تھی اور اس بار نذر آتش ہو گئی ہے جو نتیجہ

ہے میدانِ تتبل (مراجعت) کو نظرانداز کرنے کا۔ میدان تتبل کے تقاضے ہیں کہ حرام و حلال کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے، کینہ وعداوت سے اجتناب کیا جائے، مخاصمت کے بجائے مفاہمت کی راہ اختیار کی جائے۔ پانی اور آگ دونوں پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے، لیکن تخلیق آدم کے ارفع مقاصد بھی اُنھیں سے برباد ہوئے۔''(۲۳)

لوہا، سر پر اک فولادی تاج رکھے
اِس دھرتی کا سرتاج ہوا تھا
وہ دِن اور پھر آج کا دِن
اِس دھرتی پر نہ رات آئی
نہ دِن نکلا(۲۴)

لوہے کا جاگ اُٹھنا دراصل صنعتی معاشرے کی عمل داری اور اُس کے راج کا اشارہ ہے جو استعماری قوتوں کی سرایت کی جانب مڑ جاتا ہے اور انسان اُسی لوہے کا محتاج ہو کر رہ گیا ہے۔ پرندوں کا جنگل سے اُڑ جانا بھی گویا فطرت سے الگ ہو جانا ہے۔ دھواں اُگلنے سے آگ آنے والے یہ خرابے اپنے ساتھ ڈالر، ایڈز، پلاسٹک، پھوڑے، بِس بمعنی (زہر) کی پڑیاں، گیس کے گولے اپنی آنے والی نسلوں میں بانٹ رہے ہیں اور ننھی منی سندر آنکھیں کو روشن کر کے اور اُن کے سیب ایسے گالوں پر زہریلا پاؤڈر مل کر ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ بچوں کے مکھڑے چاند کی طرح روشن ہو گئے ہیں:

جب سے ہم
''اندر'' سے کٹ کر
''باہر'' میں آباد ہوئے ہیں
بھاری بوجھل آوازوں کے
قدموں میں پامال ہوئے ہیں(۲۵)

شاہین بدر نے نظم کے بطون سے پھوٹنے والی جس تہذیب(Civilization) کا احاطہ کیا ہے، اُس سے کئی نکات سامنے آتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''اِک کتھا انوکھی'' صد جہتی نظم ہے، جسے پڑھتے وقت قاری کے ذہن میں صد ہزار جہانِ معنی بیدار ہوتے ہیں۔ یہ نظم اُردو کے شعری ادب میں ایک ایسا اضافہ ہے جو پوری انسانی تاریخ کا احاطہ کرتی

ہے۔ فطرت کی آغوش سے نکل کر انسان رفتہ رفتہ صنعتی عہد میں آ گیا ہے۔ اس عہد نے اس سے اس کا فطری حسن اور معصومیت چھین لی ہے۔ مشینی عہد نے انسان کو ہلاکت اور تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔''(۲۶)

اِس طویل نظم سے بہت سے موضوعات پھوٹتے ہیں۔ جن میں سے کچھ کا تعلق ہمارے اجتماعی شعور سے بھی ہے۔ وہ خوابیدگی جس کی بیداری کے لیے دستک وقفے وقفے سے سنائی دیتی ہے، ذکاالدین شایان لکھتے ہیں:

''اِک کتھا انوکھی، کا ماحاصل یہ ہے کہ وہ نجات دلانے والا وجود اِس 'کلجگ' میں شاید اب 'ظاہر' ہونے کو تیار نہیں، وہ اپنے خواب میں ہی رہنا پسند کرتا ہے۔''(۲۷)

اور جنگل کے پنچھی سارے

آگ کے جلتے بجھتے اکھر

دور..... آکاش کی جانب اُڑ کر

چاند اور سورج کے کنگروں پر

جا بیٹھے ہیں(۲۸)

جنگل بذاتِ خود ایک وسیع علامت ہے۔ جو فطرت کا ایک پوتر روپ ہے جس سے نکل کر انسان نے خود کو ''غیر محفوظ'' بنالیا ہے۔ اِس پناہ گاہ میں تحرک تھا، اگر باقی رہنا ہے تو مسلسل لمحہ موجود میں رہنا ہی بقا کی ضمانت ہے، ڈاکٹر نیر صمدانی لکھتے ہیں:

''انسان کے ازلی خوابوں کا خون موجودہ تہذیب کے چہرے کا غازہ بن گیا ہے۔ انسان کو بچے کی طرح میکانکی کھلونے دے کر بہلایا گیا ہے۔ جب کہ انسان اپنے وجود میں سمٹ کر حقیر ہو گیا ہے۔ انسان نفرتوں کے جنگل میں گم ہے اور چلمنوں کی جگہ پتھر کی دیوار بن گئی ہے۔ سر شام کسی چاپ پر دل دھڑکنا بھول گیا ہے اور دریچوں سے جھانکنے والی بیلیں مرجھا گئی ہیں۔ وزیر آغا کے یہاں اس اثاثے کی بربادی کا غم بہت نمایاں ہے۔''(۲۹)

نظم جو ''پُرانے جنگل'' سے شروع ہوتی ہے اور ''لفظ کے دیپ'' پر ختم ہوتی ہے۔ لیکن جس شعریات کا ظہور اِس نظم میں ہوا ہے، اور جس لفظیاتی اظہاریہ کو برتا گیا ہے اُس نے نظم میں خیال، جذبے اور امیجری کو یکجا کر دیا ہے، عبداللہ جاوید لکھتے ہیں:

> ''دھوپ جو سندر تھی، اونی شال جیسی تھی، جس کا لمس ماںتا سے معمور تھا جس میں مرغابی کے پَر کی گرمی اور کچی کلیوں کی مہک تھی۔ وہ دھوپ ناری آتش کا پرکالہ ہے۔ اس لفظی پیکر کو ڈاکٹر وزیر آغا سریانی صنمیات کی فضا سے نکال کر سامی (Samitic) فضاؤں میں لا کر قاری کو طوفانِ نوح اور اس کے فوری بعد کے مرحلے میں پہنچا دیتے ہیں۔''(۳۰)

ڈاکٹر وزیر آغا ہر شعری مہم کو ''اک کتھا انوکھی'' سے تعبیر کرتے ہیں، پیش لفظ میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

> ''تخلیقِ شعر کا عمل بھی مزاجاً ایک ایسا ہی سفر ہے جو دائرے یا خطِ مستقیم کے بجائے بعض پُراسرار اُبعاد کے اندر طے ہوتا ہے۔ اِسی لیے ہر شعری مہم ایک انوکھی کتھا ہے۔ اگر وہ انوکھی نہ ہو تو پھر وہ شعری مہم نہیں، کوئی اور شے ہے۔''(۳۱)

ئزئ

آدھی صدی کے بعد

وزیر آغا کی یک کتابی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' مکتبہ اُردو زبان، سرگودھا نے جنوری ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی۔ اگرچہ اُنھوں نے اِس نظم کو اپنی منظوم سوانح عمری قرار دیا ہے، لیکن اِس پس منظر سے الگ ہو کر بھی یہ نظم اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے۔ کیوں کہ اِس میں ایک بھرپور شعری تجربہ موجود ہے۔ اِسے طویل نظم کی روایت میں ایک منفرد تخلیق بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ نظم آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی کے عناصر بھی اِس میں موجود ہیں۔ نظم چار حصوں میں منقسم ہے۔ 'جھرنا' 'ندی' 'دریا' اور 'سمندر'۔ چاروں ہیں پانی مشترکہ جوہر (قوت) ہے ۔ لیکن اِن چاروں میں پانی کی اپنی مخصوص کیفیت بھی ہے۔ ''جھرنے'' میں پانی بچے کی طرح شرارتی ہے، مختلف آوازیں نکالتا ہے۔ تیزی سے بل کھاتا ہوا اِدھر سے اُدھر جا نکلتا ہے، اوپر سے نیچے گرتا ہے۔ جب کہ ندی میں پانی کو جتنا تنگ دامنی سمیٹتی ہے وہ اُتنا ہی پھیلاؤ کی طرف جاتا ہے۔ زیرِ سطح اُس میں طغیانی کی لہریں جنم لیتی ہے لیکن بباطن دِکھائی نہیں دیتی اور پھر ''دریا'' میں پانی کی منہ زوری کو کسی بند سے روکنا ممکن نہیں رہتا۔ اُس میں ظاہری

اور باطنی ہر دو سطحوں پر طغیانی موجود ہوتی ہے اور جس کا سامنا کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ پھر ''سمندر'' بظاہر شانت مگر اپنی وسعت، بے پناہ گہرائی اور بے کنار ہونے کے باعث تخلیقیت کا بھی حوالہ بن جاتا ہے۔ یہ چار مراحل انسانی عمر میں بھی آتے ہیں اور ان کے اپنے اپنے مدارج ہیں۔ انسان جن عناصر کا مجموعہ ہے اُن میں ایک پانی بھی ہے اور پانی کی ایک شکل انسانی آنکھ میں بھی ہوتی ہے۔ غلام الثقلین نقوی رقم طراز ہیں:

''جس طرح وقت ناقابل تقسیم ہے، اِسی طرح زندگی کی آگہی اور شعور کو بھی لمحوں اور ساعتوں، بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ وقت کا تسلسل اور پانی کے نہ ٹوٹنے والا دھارا کہیں بھی آپ کو ایک دوسرے سے جُدا یا ٹوٹا ہوا محسوس نہ ہوگا۔''(۳۲)

ہر جگہ
اُلجھے بالوں، چمکتی ہوئی
تیز آنکھوں میں
''بچپن''
خنک چاندنی کی طرح
آج بھی موجزن ہے
زمانے کی رفتار پر خندہ زن ہے!!(۳۳)

پروفیسر جمیل آذر اِس طویل نظمیے کے بطون میں امکانات کو جس وسیع کینوس پر پھیلا دیکھتے ہیں، اُس کا اظہار وہ اِن الفاظ میں کرتے ہیں:

''یہ نظم نہایت ہی پہلو دار اور متنوع موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ لطف یہ ہے کہ اس کی پیش کش بیانیہ نہیں ہے، بلکہ شاعر نے انوکھی علامات، لطیف استعارات اور شاداب تمثیلات سے ہمہ جہت اور کثیر الامکانات معنی کو سمیٹا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب جسے طویل نظم بھی کہا گیا ہے، حجم کے لحاظ سے موٹی اور بھاری بھر کم نہیں ہے، بلکہ شعری امکانات اور معنوی جہات کے اعتبار سے وسیع کینوس پر پھیلی ہوئی ہے۔''(۳۴)

زمانہ تو بھیگا ہوا ایک چابک ہے
میرے بدن پر

مسلسل
انوکھے سفر کی کہانی سی اِک
لکھ رہا ہے (۳۵)

عرفانِ ذات، ایک تخلیقی تجربہ ہے، اِسے محض اندر کی غواصی سے نتھی کر دینا، دراصل اِس کے دائرہ کار کو محدود کر دینا ہے، کیونکہ اِس سے جو فضا ترتیب پاتی ہے اُس کا بیانیہ یہ ہے کہ انسان معاشرے سے کٹ کر کسی ایک ''مرکزے'' سے جُڑ جاتا ہے اور اُسے منظروں کی دھندلاہٹ، ماحول کی اجنبیت، جہانِ دیگر میں لے جاتی ہے کیونکہ شعری پیکر صرف فن یا ہنروری کا مرہون منت نہیں بلکہ عرفانِ ذات کے حوالے سے بھی ایک لطیف سا اشارہ ہے۔ وزیر آغا کے ہاں کشفی اور انجذابی ہر دو کیفیات میں وارفتگی ہے، اُن میں طے شدہ ہیئتوں کو توڑنے کی جستجو دِکھائی دیتی ہے اور ہیئت صرف سانچے کی سطح پر نہیں بلکہ اسلوب میں بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے، عبداللہ جاوید لکھتے ہیں:

> ''پانی کا استعارہ بھی اِس نظم میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ پھر برگد اور پھر ہوا..... نظم کے اواخر میں وہ اپنے ہونے کے عرفان کی بات بھی کرتے ہیں..... عرفان کا معمول کا سفر جو مشرقی فکر کی اساس ہے۔'' (۳۶)

نصف شب
جیسے خوشبو بھری گود
رستے ہوئے زخم پر جیسے پھاہا
بدن کو تھپکتی ہوئی چاندنی
سر کے ژولیدہ بالوں میں پھرتی ہوئی
ریشمی اُنگلیاں (۳۷)

وزیر آغا کی نظم کی عطا یہ ہے کہ وہ مفرد لفظ کے جوہر سے واقف ہیں بلکہ اُن کی نظم میں لفظ کا زینہ معنی سے زیادہ جذبے کی طرف اُترتا ہے۔ اُن کے ہاں لفظ کا رویہ وہی ہے جو بیج کا زمین سے ہے، یعنی زمین کے نم سے جُڑ کر جڑ پکڑتا ہے، اور پھر اُس کا اظہاریہ ایک بھرپور منظر پیش کرتا ہے۔ ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ معنی کا برتاؤ D3 اینگلز کا view پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن جذبے کا کوئی انت نہیں، کیوں کہ اِس کی بنیاد احساس پر استوار ہوتی ہے:

شب کا پچھلا پہر
پھڑ پھڑاتے ستارے
گھنی گھاس کی نوک پر آسماں
سے اُترتی نمی
اور پورب کے ماتھے پہ
قشقے کا مدھم نشاں(۳۸)

ڈاکٹر رفیق سندیلوی اِس طویل نظم کو موضوع اور بُنت ہر دو سطح پر پرکھتے ہیں،اور اُس پُراسرایت کو مس کرنے کی کوشش کرتے ہیں جہاں وزیر آغا نے اپنی ذات کی یافت کی ہے، چناں چہ وہ لکھتے ہیں:

''آدھی صدی کے بعد' ایک ایسی نظم ہے جو اپنی باطنی اُنگلیوں کی مدد سے ذات و کائنات کی گرہیں کھولتی ہے.....اِس نظم میں موضوع اور ہیئت آپس میں اِس طرح چمٹے ہوئے ہیں کہ اُنھیں کھرچ کر ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ نظم میں خیال کا سارا سفر خوش اسلوبی سے طے ہوا ہے۔ یہاں رہوارِ تخیل بے تحاشا اور بے محابا نہیں دوڑتا کہ ہم اُس کے سموں سے اُٹھنے والی گرد میں کچھ دیکھ ہی نہ پائیں۔''(۳۹)

وزیر آغا شاعری میں جمالیاتی نظریے کے قریب ہیں،اُن کے وجدانی جوہر کا اظہار یوں تو اُن کی ساری شاعری میں محسوس کیا جاسکتا ہے لیکن نظم میں اِس کی رعنائی کہیں زیادہ ہے،اُنھوں نے علامت کو ابہام تک نہیں پہنچنے دیا، بلکہ علامت کے ارتقائی تجربے کو بھی شعری واردات سے مملو کر دیا ہے،انور جمال لکھتے ہیں:

''جھرنے سے سمندر تک کے مناظر میں جو Temporal Contiguity پائی جاتی ہے،اس کی وجہ سے یہ نظم تخلیق میں بچپن اور اس کے خوابوں کو ایک نفسیاتی Treatment دیا گیا ہے۔ یہ انسان اگر اپنے ماضی کے دریچوں میں سے جھانکے تو اسی قسم کی پرچھائیں ذہن پر سوار ہوتی ہیں۔''(۴۰)

تب ہوا نے
بیاضِ زمیں کھول دی
اور رنگین اوراق

اُڑنے لگے

لفظ

جملوں کی شاخوں سے نیچے

اُترنے لگے (۴۱)

ترکیب سازی، شاعری میں ایک ایسا حربہ ہے جس سے تخلیقی جست کا تصور پیدا ہوتا ہے، مگر یہ بھی مد نظر رہے کہ تراکیب، ہیجانی کیفیات کو جنم دیتی ہیں جن میں چونکنے اور متحرک ہونے کی فضا از خود بیدار ہو جاتی ہے ،وزیر آغا نے نظم کی بُنت میں اِس سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن اِسے اظہاری اختصاص کے طور پر برتا ہے۔ نیز وہ اساطیر کی کہنگی میں بھی تخلیق کا نم پیدا کر دیتے ہیں، جس سے اُن کے ہاں شعری ارتباط کا اظہار ہوتا ہے، اختر احسن لکھتے ہیں:

> وزیر آغا کی طویل نظم مختلف ذاتی، تاریخی، لمحاتی اور دیومالائی حوالوں سے گزرتی ہوئی ابدیت کا ایک خوبصورت تار و پود بُنتی ہے۔ شانگری لا، طوفانِ نوح، یم راج اور تاریخ کا مابعد، سب گھل مل کر جڑ کی وحدت اور اس کے اوتاروں کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ نظم اِن اشکال کے ذریعے ایک کائناتی روح کی مثال بن جاتی ہے۔ (۴۲)

مگر سبز دھرتی کی

ٹھنڈی تہوں میں

جڑوں کی پُراسرار وحدت تھی

سب فاصلے

ایک نقطے میں سمٹے ہوئے تھے (۴۳)

''آدھی صدی کے بعد'' میں سوانحی تاثر بھی ہے، عام رویہ یہی ہے کہ خود نوشت سوانح نگار، نثر و نظم دونوں اصناف میں اپنے آپ کو ''مرکز'' مان کر تانے بانے بُنتا ہے اور خود نوشت سوانح عمری میں یہ کسی حد تک فطری بھی معلوم ہوتا ہے لیکن اِس نظم کی خوبصورتی یہ ہے کہ وزیر آغا نے اپنے سوانحی حالات کو منظوم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے فکری دھارے سے بھی مربوط کر دیا ہے۔ فضیل جعفری کی رائے دیکھئے:

''آدھی صدی کے بعد' مجھے اِس لیے بطور خاص پسند ہے کہ اِس نظم میں وزیر آغا نے نہ صرف ہیئت اور موضوع کے اعتبار سے عمومی اسلوب اور ڈکشن کے اعتبار سے بھی اپنی تمام تر پچھلی نظموں پر تنقیدی نگاہ ڈالتے ہوئے قدم آگے بڑھایا ہے۔''(۴۴)

اِس طویل نظم میں سومبر (ہندوؤں کی قدیم رسم) اوڈیسس (یونان کی ایک رزمیہ داستان کا ہیرو) قاف (ایک پہاڑ جہاں پریاں آباد ہیں) شانگری لا (ناول، لاسٹ ہورائیزن کا ایک خیالی شہر) لچھمن ریکھا (رام اور سیتا کی کہانی کی طرف اشارہ) یم راج (ہندو دیومالا میں موت کے فرشتے کا نام ہے) ایسی تلمیحات بھی در آئی ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے اِس نظم کو اپنی سوانح عمری قرار دیا ہے، مگر اُنھوں نے کہیں بھی اپنے آپ کو مرکز عالم نہیں بنایا اور نہ ہی اپنے قاری کو بھٹکنے دیا، اُن کا یہ سفر، سیاحتِ باطنی کا مرقع ہے، پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں:

''آدھی صدی کے بعد'' دراصل میری اُس واپسی کے سفر ہی کی داستان ہے بلکہ یہ تو بجائے خود ایک مہم ہے، کیونکہ واپسی کے سفر میں مجھے پہلی بار وہ سب کچھ نظر آیا ہے جو اِن طویل مسافتوں میں ہمہ وقت دعوتِ نظارہ تو دیتا ہے مگر جو مجھے اپنے سفر کے دوران محض اس لیے نظر نہ آیا تھا کہ میری آنکھ بیدار نہیں تھی۔''(۴۵)

ڈاکٹر وزیر آغا کی طویل نظمیں نہ صرف اپنے اسلوب کے محاسن کے باوصف اپنے قاری کو متوجہ کرتی ہیں بلکہ طویل نظم کو بطور صنف اپنی شناخت بنانے کے لیے بطور فن پارے کے اپنے وجودی اظہاریے کی دین ہیں۔ جس میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے تلازمے اور اشارے کثرت سے ملتے ہیں، جس سے ترسیل اور تشکیل کا بُعد کم ہوتا دِکھائی دیتا ہے۔ وزیر آغا بطور نظم نگار نئی ڈکشن اور نئی استعاراتی اور تفہیمی اشکال کو متصور کرنے والے شاعر ہیں اور اُن کی طویل نظمیں اِس تاثر کو مزید گہرا کرتی ہیں۔

حوالے و حواشی

1۔ وزیر آغا، ڈاکٹر: گھاس میں تتلیاں (لاہور: مکتبہ فکر و خیال، 1985ء) ص 133

2۔ ایضاً، ص 131

3۔ امین راحت چغتائی: ''وزیر آغا کی طویل نظمیں'' مشمولہ کاغذی پیرہن (شمارہ 14، لاہور: مئی، جون 2005ء) ص 97

4۔ وزیر آغا،ڈاکٹر:''الاؤ''مشمولہ اورا ق(لاہور:مئی،جون1983ء)ص19
5۔ تخت سنگھ:''آپس کی باتیں''مشمولہ اورا ق لاہور:نومبر،دسمبر،1983ء)ص264
6۔ بلراج کومل:''رائے''مشمولہ شام کا سورج مرتب:ڈاکٹرانور سدید(لاہور:مکتبہ فکروخیال،،1989ء)ص302
7۔ وزیر آغا،ڈاکٹر:''الاؤ''مشمولہ اورا ق لاہور:مئی،جون1983ء)ص19
8۔ احمد ظفر:''آپس کی باتیں''مشمولہ اورا ق(لاہور:نومبر،دسمبر،1983ء)ص265
9۔ مظہر الزمان خان:''آپس کی باتیں''مشمولہ اورا ق(لاہور:نومبر،دسمبر،1983ء)ص270
10۔ سنتوکھ سری:ایضاً،،ص277
11۔ وزیر آغا،ڈاکٹر:''ٹرمینس''مشمولہ سمبل(راول پنڈی،جولائی تا دسمبر2007ء)ص413
12۔ ایضاً،ص420
13۔ ایضاً،ص420
14۔ ایضاً،ص420
15۔ امین راحت چغتائی:''وزیر آغا کی طویل نظمیں''مشمولہ:کاغذی پیرہن لاہور،مئی،جون2005ء،ص94
16۔ ارمان نجمی:بیاض شب و روز لاہور:کاغذی پیرہن،2001ء،ص23
17۔ وزیر آغا،ڈاکٹر:اِک کتھا انوکھی لاہور:مکتبہ فکروخیال،1990ء،ص11
18۔ ناصر عباس نیئر،ڈاکٹر:تجزیاتی مطالعہ مشمولہ کاغذی پیرہن(طویل نظم نمبر،لاہور،مارچ،اپریل،2003ء،ص26
19۔ وزیر آغا،ڈاکٹر:اِک کتھا انوکھی(لاہور:مکتبہ فکروخیال،1990ء)ص15
20۔ وزیر آغا،ڈاکٹر: عجب اِک مسکراہٹ''(پس ورق،سرگودھا:مکتبہ نردبان)1997ء
21۔ ایضاً
22۔ وزیر آغا،ڈاکٹر:عجب اِک مسکراہٹ(پس ورق،سرگودھا:مکتبہ نردبان)1997ء
23۔ امین راحت چغتائی''وزیر آغا کی طویل نظمیں''مشمولہ کاغذی پیرہن(لاہور،مئی،جون2005ء)ص101
24۔ وزیر آغا،ڈاکٹر،:اِک کتھا انوکھی (لاہور:مکتبہ فکروخیال،1990ء)ص19
25۔ ایضاًص30
26۔ شاہین بدر''رائے''مشمولہ سہ ماہی ابجد(شمارہ۲،سرگودھا:ردیف فورم،2018ء)ص89
27۔ ذکاالدین شایان''آپس کی باتیں''مشمولہ اوراق لاہور،دسمبر،1990ء)ص344
28۔ وزیر آغا،ڈاکٹر:اِک کتھا انوکھی (لاہور:مکتبہ فکروخیال،1990ء)ص34
29۔ نیر صمدانی،ڈاکٹر:اعتبارات(لاہور:وکٹری بک بنک،1998ء)ص133
30۔ عبداللہ جاوید''ڈاکٹر وزیر آغا کی دو طویل نظمیں''مشمولہ روشنائی(کراچی،جولائی تا ستمبر2011ء)ص37
31۔ وزیر آغا،ڈاکٹر : اِک کتھا انوکھی(پیش لفظ،لاہور:مکتبہ فکروخیال،1990ء)ص8

32۔ غلام الثقلین نقوی آدھی صـــدی کے بعد مشمولہ شام کا سورج مرتب؛ڈاکٹر انور سدید (لاہور: مکتبہ فکر و خیال، 1989ء)ص335

33۔ وزیر آغا،ڈاکٹر:آدھی صدی کے بعد سر گودھا: مکتبہ نردبان، جنوری 1981،)ص27

34۔ جمیل آذر، پروفیسر (تجزیہ) مشمولہ جدید ادب(رحیم یار خان، فروری 1982ء)ص72-73

35۔ وزیر آغا،ڈاکٹر: آدھی صدی کے بعد(سر گودھا: مکتبہ نردبان، جنوری 1981ء)ص37

36۔ عبداللہ جاوید ''ڈاکٹر وزیر آغا کی دو طویل نظمیں''،مشمولہ روشنائی(کراچی، جولائی تا ستمبر 2011ء)ص31

37۔ وزیر آغا،ڈاکٹر:آدھی صدی کے بعد سر گودھا: مکتبہ نردبان، جنوری 1981ء)ص24

38۔ ایضاً،ص103-104

39۔ رفیق سندیلوی،ڈاکٹر: ڈاکٹر وزیر آغا:شخصیت اور فن (معمارِ ادب۔اسلام آباد: اکادمی ادبیات، 2006ء)ص44

40۔ انور جمال: آدھی صدی کے بعد(تجزیہ) مشمولہ مطلع نومبر، دسمبر 1983، ص61

41۔ وزیر آغا،ڈاکٹر: آدھی صدی کے بعد(سر گودھا: مکتبہ نردبان، جنوری 1981)ص58

42۔ اختر احسن(تجزیہ) مشمولہ:شام کا سورج مرتب؛ڈاکٹر انور سدید(لاہور: مکتبہ فکر و خیال، 1989ء)ص389

43۔ وزیر آغا،ڈاکٹر: آدھی صدی کے بعد(سر گودھا: مکتبہ نردبان، 1981ء)ص101

44۔ فضیل جعفری ''وزیر آغا کی شاعری''،مشمولہ شـام کا سـورج مرتب؛ڈاکٹر انور سدید(لاہور: مکتبہ فکر و خیال، ۱۹۸۹ء)ص411-412

45۔ وزیر آغا،ڈاکٹر: آدھی صدی کے بعد پیش لفظ(لاہور، مکتبہ فکر و خیال، طبع چہارم، 1989ء)ص6

Kitabeen

i- Wazir Agha, dr: *Aadhi Sadi ke Bad*, Sargodha: Maktaba-e-Nardeban, January,1981

ii- Wazir Agha, dr: *Ghas mein Titleyan*, Lahore: Maqtaba-e- Fikro Khayal 1985

iii- Rafiq Sandilvi, dr. *Wazir agha Shashsiyat Aur Fan*, Memar-e-Adab, Islamabad 2006

iv- Anwar Sadeed, dr, *Sham ka Shoraj*, Lahore: Maqtaba-e- Fikro Khayal, 1989

v- Arman Najmi : *Beyaz-e-Roz-o-Shab*, Lahore: Kaghazi Perahan, 2001

vi- Nayyar Samdhani, *Aetbarat*, Lahore:Victory Book Bank,1998

Adbi Magzene:

i- AURAQ, Lahore (May-June 1983, November-December1983)
ii- MATLA(November-December 1983)
iii- JADEED ADAB, Rahim Yar Khan (Feb.1982)
iv- ROSHANAI(July-September 2011)
v- ABJAD, Sargodha (Feb. 2018)
vi- SEMBAL, Rawalpandi (July- December 2007)
vii- KAGHAZI PERAHAN, Lahore (May-June 2005)